8

’دیسی لوگوں‘ کو متمدن کرنا، قوم کو تعلیم یافتہ بنانا

پچھلے ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ برطانوی حکومت نے راجاؤں، نوابوں، کسانوں اور قبائلیوں کی زندگی پر کیا اثر ڈالا۔ اس باب میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ طلبا کی زندگی پر برطانوی حکومت کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ برطانیہ نہ صرف اپنے مقبوضات کی توسیع اور محصول پر کنٹرول چاہتا تھا بلکہ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ یہ ان کا ایک تہذیبی مشن بھی ہے۔ انھیں ’’دیسی لوگوں کو متمدن بھی بنانا تھا‘‘ اور ان کے رسم و رواج اور ان کی قدروں کو بھی تبدیل کرنا تھا۔

ماہر لسانیات (Linguist) – جو شخص مختلف زبانوں پر عبور رکھتا اور ان کا مطالعہ کرتا ہے۔

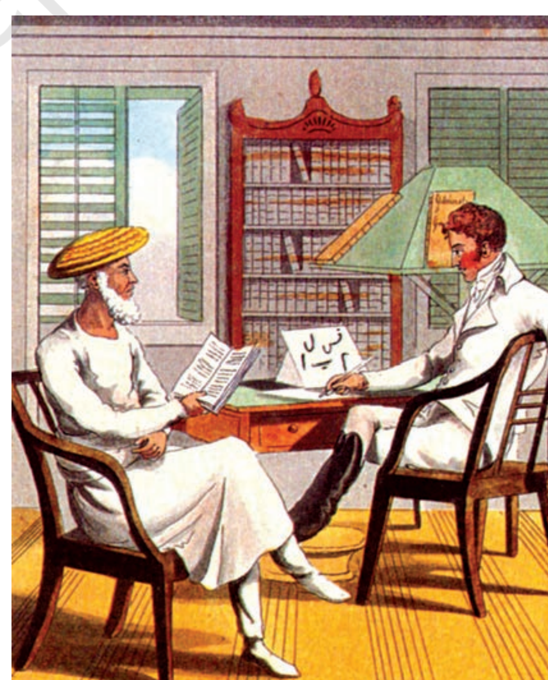
تبدیلیاں کیا لائی جائیں؟ ہندوستانیوں کو کس طرح متمدن اور تعلیم یافتہ بنایا جائے اور ان کو برطانیہ کی نظر میں ’’اچھی رعایا‘‘ کس طرح بنایا جائے؟ ان سوالوں کا انگریزوں کے پاس کوئی سیدھا جواب نہیں تھا۔ ان سوالوں پر کئی دہائیوں تک بحث ہوتی رہی۔

برطانیہ کا تصور تعلیم

آیئے دیکھتے ہیں کہ برطانیہ نے کیا سوچا اور کیا عمل کیا اور یہ بھی غور کرتے ہیں کہ تعلیم کے جن نظریات کو ہم نے تسلیم کرلیا ہے پچھلے دو سو سال کے عرصے میں ان کا ارتقا کیسے ہوا۔ ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ برطانوی نظریات کے بارے میں ہندوستانیوں کا کیا ردعمل تھا اور ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے اپنے کیا نظریات تھے۔

مشرق شناسی کی روایت

1783 میں ولیم جونز (William Jones) نامی ایک شخص کلکتہ آیا۔ یہ شخص اس سپریم کورٹ کا جونیئر جج مقرر کیا گیا جسے کمپنی نے قائم کیا تھا۔ ایک



شکل 1 – ولیم جونز فارسی سیکھتے ہوئے

ماہر قانون داں ہونے کے علاوہ، جونز ایک ماہر لسانیات بھی تھا۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھی تھیں۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس نے ایک دوست سے عربی بھی سیکھ لی تھی۔ فارسی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ کلکتہ میں وہ ہر روز بہت سا وقت پنڈتوں کے ساتھ گزارتا اور ان سے سنسکرت زبان، اس کے قواعد اور شعر کی باریکیاں سمجھا کرتا تھا۔ جلد ہی اس نے قانون، فلسفہ، مذہب، سیاست، اخلاقیات، ریاضی، میڈیسن اور دیگر علوم پر قدیم ہندوستانی متون کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جونز کو معلوم ہوا کہ اس زمانے میں اس کے علاوہ کلکتہ میں مقیم بہت سے برطانوی عہدے دار بھی ان علوم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہنری ٹامس کولبروک (Henry Thomas Colebrooke) اور نتھانئیل ہالہیڈ (Nathaniel Halhed) جیسے انگریز بھی قدیم ہندوستانی ورثے کی بازیافت، ہندوستانی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے اور انگریزی زبان میں فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان سب کے ساتھ مل کر جونز نے ''ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' قائم کی اور ''ایشیاٹک ریسرچز'' نامی ایک جرنل بھی نکالا۔

جونز اور کولبروک ہندوستان کے بارے میں ایک مخصوص ذہن کے نمائندے بن گئے۔ یہ دونوں قدیم ثقافتوں کا بڑا احترام کرتے تھے خواہ وہ ہندوستانی ہو یا مغربی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی تہذیب عہد قدیم میں اپنی شان اور عظمت حاصل کر چکی تھی بعد میں بتدریج زوال پذیر ہوتی گئی۔ ہندوستان کو سمجھنے کے لیے ان مذہبی اور قانونی متون کی بازیافت ضروری ہے جو قدیم زمانے میں وجود میں آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہی متون ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین اور حقیقی افکار و خیالات جاننے کا ذریعہ ہیں اور انھیں متون کا جدید مطالعہ ہندوستان کے مستقبل کی ترقی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

چنانچہ جونز اور کولبروک قدیم متون کی بازیافت، ان کی تفہیم اور ترجمے میں مصروف ہو گئے اور اپنی تحقیق و جستجو دوسروں تک پہنچانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے نہ صرف برطانوی لوگ ہندوستانی تہذیب سیکھ سکیں گے بلکہ خود ہندوستانیوں کو بھی اپنے ورثے کی بازیافت میں مدد ملے گی اور وہ اپنے ماضی کی گمشدہ عظمت کو پہچان سکیں گے۔ اس عمل میں انگریز ہندوستانی تہذیب کے سرپرست بھی ہو جائیں گے اور اس کے آقا بھی۔



شکل 2 – ہنری ٹامس کولبروک
یہ سنسکرت اور ہندوستان کی قدیم مذہبی تحریروں کا عالم تھا۔

مدرسہ – ایک عربی لفظ ہے یعنی وہ جگہ جہاں پڑھائی ہوتی ہو یا کسی بھی قسم کا اسکول یا کالج ہو۔



شکل 3 – وارن ہیسٹنگز کی یادگار، رچرڈ ویسٹ ماکوٹ، 1830،
اب وکٹوریہ میموریل (کلکتہ) میں موجود ہے
یہ تصویر بتاتی ہے کہ **مستشرقین** ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہیسٹنگز کی شاہی شبیہ کے ایک طرف کھڑے ہوئے پنڈت کی شبیہ ہے اور دوسری طرف ایک بیٹھے ہوئے **منشی** کی۔ ہیسٹنگز مستشرقین کا پرجوش حامی تھا۔ اسے اور دیگر مستشرقین کو 'ورناکولز' زبانیں پڑھنے کے لیے ہندوستانی عالموں کی ضرورت تھی جو ان کے مقامی آداب وقوانین بتا سکتے اور ان کے لیے قدیم متون کا ترجمہ وتشریح کر سکتے۔ ہیسٹنگز نے کلکتہ کا مدرسہ قائم کر کے اس سلسلے میں پہل کی۔ اس کا یقین تھا کہ ملک کی قدیم تہذیب وثقافت اور مشرقی علوم کو ہندوستان میں برطانوی راج کی بنیاد بننا چاہیے۔

انھیں خیالات سے متاثر ہو کر کمپنی کے بہت سے عہدیدار اس بات کے حق میں تھے کہ یہاں مغربی تعلیم کے بجائے ہندوستانی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں قدیم ہندوستانی علوم کے مطالعے کی حوصلہ افزائی ہو اور جہاں سنسکرت اور فارسی ادبیات اور شاعری کی تعلیم دی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو وہی علوم سکھائے جائیں جن سے وہ پہلے ہی مانوس ہیں اور جن کی قدر بھی کرتے ہیں۔ انھیں وہ علوم نہ پڑھائے جائیں جو ان کے لیے اجنبی ہوں۔ ان کو یقین تھا کہ اس عمل سے برطانیہ ''دیسی لوگوں'' کے دلوں میں جگہ بنا سکے گا اور اس کی رعایا بدیسی حاکموں کی عزت کرے گی۔

اسی نظریے کے تحت 1781 میں کلکتہ میں عربی، فارسی اور اسلامی قوانین کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ اسی طرح 1791 میں بنارس میں ان قدیم سنسکرت متون کے مطالعے کے لیے ایک ہندو کالج قائم کیا گیا تاکہ وہ ملک کے انتظامی امور میں مفید ہو۔

کمپنی کے سارے عہدیدار ایسے خیالات سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ ان میں اکثر مستشرقین کے شدید نکتہ چیں بھی تھے۔

''مشرق کی سنگین غلطیاں''

انیسویں صدی کے اوائل ہی سے مختلف برطانوی عہدیداروں نے متشرقین کے نظریے پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مشرقی علوم خامیوں سے پُر اور غیر سائنسی

مستشرقین (Orientalists) – ایشیائی زبانوں اور ثقافتوں کے عالم اور محقق۔

منشی – جو شخص فارسی لکھ پڑھ سکے اور پڑھا سکے۔

ورناکولر – یہ لفظ عام طور پر کسی مقامی بولی یا زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو معیاری زبان سے مختلف ہو۔ ہندوستان جیسے نوآبادیاتی ملک میں انگریزوں نے اس اصطلاح کا استعمال انگریزی اور مقامی زبانوں میں فرق کرنے کے لیے کیا، کیوں کہ انگریزی شاہی آقاؤں کی زبان تھی۔

خیالات پر مبنی ہیں۔ ان کے خیال میں مشرقی ادب غیر سنجیدہ اور ہلکا پھلکا ہے۔ اس لیے برطانیہ کے لیے کسی طرح یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ عربی اور سنسکرت زبان وادب کو پڑھانے کی حوصلہ افزائی کریں۔

جیمز مل (James Mill) بھی انھیں لوگوں میں سے تھا جس نے مستشرقین پر شدید تنقید کی۔ اس نے واشگاف انداز میں کہا کہ برطانیہ یہ غلطی نہ کرے کہ دیسی لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یا ''ان کا دل جیتنے کے لیے'' انھیں وہ علوم سکھائے جنھیں وہ پسند کرتے ہیں یا جن کو وہ محترم سمجھتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ مفید اور قابل عمل علوم پڑھائے جائیں۔ اس طرح ہندوستانیوں کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے واقف کرایا جائے اور مشرق کی شاعری اور مقدس صحیفوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔

1830 کی دہائی آتے آتے مستشرقین پر حملے تیز ہو گئے۔ ٹامس بابینگٹن میکالے (Thomas Babington Macaulay) ان ناقدین میں سب سے زیادہ منھ زور اور بااثر تھا۔ وہ ہندوستان کو ایک غیر مہذب ملک سمجھتا تھا جسے مہذب بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے خیال میں مشرق کے کسی بھی علم کا موازنہ ان علوم سے نہیں کیا جا سکتا جو انگلینڈ کی پیداوار ہیں۔ اس نے لکھا کہ اس بات سے کون انکار کرے گا کہ ''یورپ کی کسی اچھی لائبریری کا ایک ہی شیلف ہندوستان اور عرب کے تمام دیسی ادب سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہندوستان میں مشرقی علوم کے فروغ پر سرکاری پیسہ کو برباد نہ کرے، اس لیے کہ اس ذخیرے کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہے۔

شکل 4 – ٹامس بابینگٹن میکالے اپنے مطالعہ گاہ میں



میکالے نے بڑی شدت اور جوش وخروش سے انگریزی زبان پڑھائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے خیال میں انگریزی زبان سے واقف ہو کر ہی ہندوستانی لوگ دنیا کے کچھ اعلیٰ ادبی نمونوں سے واقف ہو سکیں گے۔ انگریزی زبان کے ذریعے ہی وہ مغربی سائنس اور مغربی فلسفے کی ارتقا سے روشناس ہو سکیں گے۔

2018-19

میکالے کی اس تجویز کے بعد انگلش ایجوکیشن ایکٹ 1835 نافذ کیا گیا۔ اس کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا اور کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج جیسے مشرقی اداروں کے فروغ کو روک دینا تھا۔ ان اداروں کو ''زوال آمادہ تاریکی کے مندر'' کہا گیا۔ اس کے تحت اسکولوں کے لیے انگریزی کی درسی کتابیں تیار کی گئیں۔

تعلیم برائے تجارت

1854 میں لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو ایک تعلیمی مراسلہ بھیجا۔ یہ مراسلہ جسے کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر چارلس ووڈ (Charles Wood) نے جاری کیا تھا۔ تاریخ میں یہ مراسلہ ووڈ مراسلہ (Wood's Despatch) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مراسلے میں ہندوستان میں اپنائی جانے والی تعلیمی پالیسی کا خاکہ پیش کیا گیا تھا اور ایک بار پھر مشرقی تعلیم کے مقابلے یورپی نظام تعلیم کے عملی فائدوں پر زور دیا گیا تھا۔

مراسلے میں تعلیم کے جن عملی فائدوں کی طرف اشارے کیے گئے تھے ان میں ایک فائدہ اقتصادی بھی تھا۔ اس مراسلے میں کہا گیا تھا کہ یوروپی تعلیم سے ہندوستانی ان فائدوں کو سمجھ سکیں گے جو کاروبار اور تجارت کی توسیع کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ملکی وسائل کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستانی اگر یورپ کی زندگی کے طور طریقوں سے واقف ہو جائیں گے تو ان کے مذاق اور ان کی خواہشات اور آرزوؤں میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ اس سے ہندوستان میں برطانوی مال کی مانگ بھی پیدا ہوگی۔ وہ یوروپ کی بنی چیزیں خریدیں گے بھی اور ان کی تعریف و تحسین بھی کریں گے۔

ووڈ مراسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ یوروپین تعلیم سے ہندوستانیوں کا اخلاقی کردار بھی بہتر ہوگا۔ اس تعلیم سے ان میں صداقت پسندی اور ایمانداری پیدا ہوگی اور اس طرح یہ تعلیم کمپنی کو ایسے ملازمین مہیا کر سکے گی جو اعتماد اور اعتبار کے قابل ہوں گے۔ مشرقی ادب نہ صرف سنگین خامیوں سے پُر ہے بلکہ اس سے نہ فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ضروری انتظامی صلاحیتوں کو فروغ ملتا ہے۔

1854 کے اس مراسلے کے تحت برطانوی حکومت نے کئی اقدام اٹھائے۔ جملہ تعلیمی امور کو قابو میں رکھنے کے لیے تعلیم کے سرکاری محکمے قائم کیے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن نظام قائم

ماخذ 1

اہلِ خرد کی زبان؟

انگریزی زبان پڑھانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے میکالے لکھتا ہے:

سبھی فریق اس ایک نقطے پر متفق ہیں کہ ہندوستانی لوگوں کے درمیان عام طور پر بولیاں بولی جاتی ہیں جن میں نہ ادب ہے اور نہ سائنسی معلومات۔ اس کے علاوہ یہ بولیاں اتنی بے مایہ اور اکھڑ ہیں کہ بغیر کسی بیرونی مدد کے ان میں کسی ڈھنگ کے متن کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا......

ٹامس بابنگٹن میکالے،
انڈین ایجوکیشن سے متعلق تجویز
2 فروری 1835

ماخذ 2

یوروپی علوم کے حق میں دلیل

1854 کا ووڈ مراسلہ مشرقی علوم کے مخالفین کی فتح کی نشانی تھا۔ اس میں لکھا تھا:

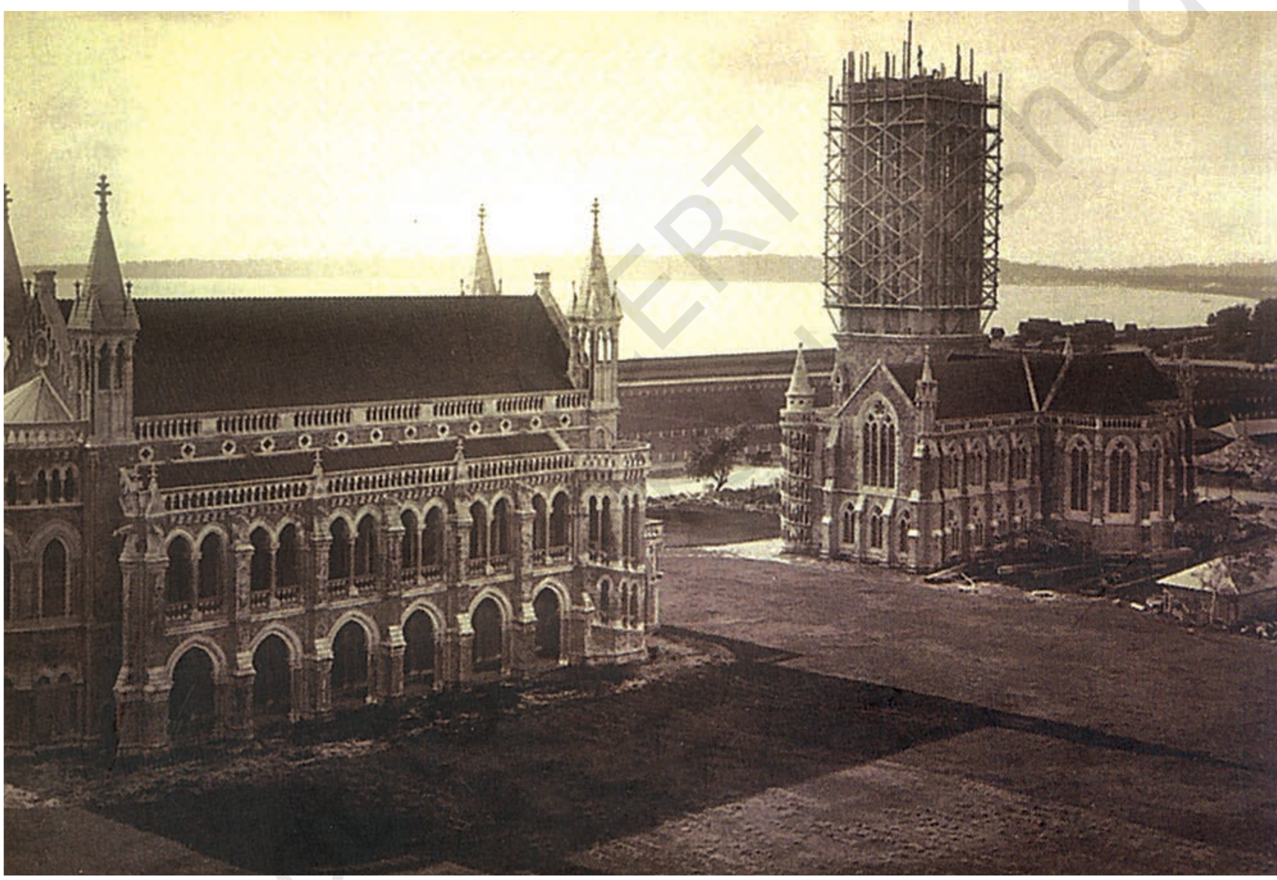
ہمیں یہ بات پر زور انداز میں واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستان میں ہم جس تعلیم کی توسیع چاہتے ہیں اس کا مقصد یوروپ کے ترقی یافتہ فنون، سروسز، فلسفہ اور ادب یا بطور اختصار یوروپین علوم کو فروغ دینا ہے۔

کرنے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ 1857 میں جب میرٹھ اور دہلی کے سپاہیوں نے بغاوت کی تو کلکتہ، مدراس اور ممبئی میں یونیورسٹیاں قائم کرنے کا عمل جاری تھا۔ اسکولی تعلیمی نظام میں بھی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں۔

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ 1850 کی دہائی میں رہتے ہیں۔ آپووڈ مراسلے کے بارے میں سنتے ہیں۔ آپ اپنے ردعمل کو تحریر کیجیے۔

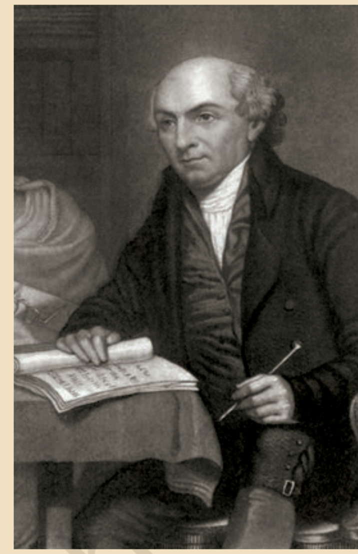
شکل 5 – انیسویں صدی میں بمبئی یونیورسٹی کا منظر



مقامی اسکولوں پر کیا گذری؟

کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ برطانوی عہد حکومت سے قبل بچوں کو کس طرح پڑھایا جاتا تھا؟ آپ کے خیال میں کیا وہ اسکول جاتے تھے؟ اور اگر وہ اسکول جاتے تھے تو برطانوی عہد میں ان اسکولوں پر کیا گذری؟

اخلاقی تعلیم کی مانگ



شکل 6 – ولیم کیرے اسکاٹ لینڈ کے ایک عیسائی مبلغ تھے جنھوں نے سرام پور میں مشن کے قیام میں مدد کی تھی

انیسویں صدی میں عیسائی مبلغین نے عملی تعلیم (Practical Education) کے حق میں دلائل پر زبردست تنقید کی، عیسائی مبلغین کا خیال تھا کہ تعلیم کا مقصد لوگوں کے اخلاقی کردار میں سدھار لانا ہے اور اخلاقیات کو صرف عیسائی تعلیمات کے ذریعے ہی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

1813 تک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کی مخالف رہی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں سے مقامی لوگ مشتعل ہوں گے اور وہ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی سے شبہات میں مبتلا ہوں گے۔ برطانیہ کے زیر تصرف علاقوں میں عیسائی مبلغین کوئی ادارہ قائم نہ کر سکے تو انھوں نے ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تصرف علاقے میں سرام پور میں ایک مشن قائم کر لیا، 1800 میں ایک چھاپہ خانہ اور پھر 1818 میں ایک کالج قائم کر لیا۔

انیسویں صدی کے دوران پورے ہندوستان میں مشنری اسکول قائم ہو گئے۔ 1857 کے بعد برطانوی حکومت مشنری تعلیم کی براہ راست حمایت کرنے سے بچنا چاہتی تھی۔ اس کے پیچھے یہ احساس تھا کہ مقامی رسوم، مقامی طور طریقوں، عقائد اور مذہبی نظریات پر کوئی بھی شدید حملہ کہیں ''دیسی لوگوں'' کے جذبات کو مشتعل نہ کر دے۔



شکل 7 – کلکتے کے قریب دریائے ہگلی پر واقع سرام پور کالج کی تصویر

ولیم ایڈم کی رپورٹ



شکل 8 – گاؤں کی پاٹھ شالا

یہ ایک ڈچ مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ یہ مصور جس کا نام فرانکوئز سولون تھا اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی تصاویر میں لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

1830 کی دہائی میں اسکاٹ لینڈ کے ایک عیسائی مبلغ ولیم ایڈم (William Adam) نے بہار اور بنگال کے ضلعوں کا دورہ کیا۔ کمپنی نے ان سے مقامی زبانوں کے اسکولوں (Vernacular Schools) میں تعلیمی حالت کی رپورٹ مانگی۔ ولیم ایڈم نے جو رپورٹ دی وہ بہت دلچسپ ہے۔

ولیم ایڈم نے پایا کہ بہار اور بنگال میں ایک لاکھ سے زیادہ پاٹھ شالائیں ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے تعلیمی ادارے تھے جن میں بیس سے زیادہ طالب علم نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ان پاٹھ شالاؤں میں پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد 'قابل لحاظ' یعنی بیس لاکھ سے اوپر تھی۔ یہ ادارے دولت مند لوگوں یا پھر مقامی لوگوں کے قائم کردہ تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی استاد (گرو) اپنا ادارہ خود قائم کر لیتا تھا۔

تعلیم کا نظام لچیلا تھا۔ آج جن چیزوں کا تصور اسکول سے وابستہ ہے ان میں سے کچھ ہی زمانے کی پاٹھ شالائوں میں موجود تھیں۔ کوئی مقررہ فیس نہیں تھی، مطبوعہ کتابیں نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی اسکول کے لیے الگ سے کوئی عمارت ہوتی تھی۔ نہ کرسیاں ہوتیں نہ بنچیں، نہ بلیک بورڈ اور نہ ہی کلاسوں کا جداگانہ نظام، نہ حاضری کا رجسٹر ہوتا، نہ سالانہ امتحان ہوتا اور نہ کوئی باقاعدہ نظام الاوقات ہوتا تھا۔ کچھ جگہوں پر کلاسیں کسی برگد کے پیڑ کے نیچے، کہیں گاؤں کی کسی دوکان کے کونے میں یا مندر میں ہوجاتیں یا پھر گرو کے گھر میں ہوجاتیں۔ فیس والدین کی آمدنی پر منحصر ہوتی۔ دولت مند لوگ غریبوں کے مقابلے زیادہ فیس دیتے۔ تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی اور خود گرو یہ فیصلہ کرتا کہ وہ کیا پڑھائے گا۔ وہ یہ فیصلہ طلبا کی ضروریات کو دھیان میں رکھ کر کرتا۔ بچوں کی الگ الگ کلاس میں درجہ بندی نہ کی جاتی۔ سب بچے ایک ہی جگہ بیٹھتے۔ استاد بچوں کی تعلیمی سطح کے لحاظ سے ان کے مختلف گروہوں کو پڑھاتا۔

ایڈم نے پایا کہ یہ لچیلا نظام مقامی ضروریات کے لحاظ سے درست تھا۔ مثال کے طور پر فصل کی کٹائی کے دنوں میں کلاسیں نہیں لگتی تھیں کیوں کہ اس وقت دیہی بچے کھیتوں پر کام

سرگرمی

1۔ تصور کیجیے کہ آپ کی پیدائش 1850 کی دہائی میں ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ سرکاری پاٹھ شالاؤں کے نئے نظام کے آنے پر آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟

2۔ کیا آپ کو علم تھا کہ پرائمری اسکول جانے والے پچاس فی صد بچے 13 یا 14 سال کی عمر تک پہنچ کر اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا آپ اس کے امکانی اسباب بتا سکتے ہیں؟

کرنے چلے جاتے تھے۔ جب فصلیں کٹ جاتیں اور اناج کھلیانوں میں اکٹھا ہوجاتا تو پاٹھ شالائیں پھر سے شروع ہوجاتیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کھیتی باڑی کرنے والے خاندانوں کے بچے بھی پڑھ سکتے تھے۔

نئے معمولات، نئے ضوابط

انیسویں صدی کے وسط تک کمپنی کی دلچسپی بنیادی طور پر اعلیٰ تعلیم سے رہی۔ اس لیے اس نے مقامی پاٹھ شالاؤں کو بغیر کسی مداخلت کے ایسے ہی چلنے دیا۔ 1854 کے بعد کمپنی نے ورنا کولر ایجوکیشن (مقامی زبان میں تعلیم) کے نظام میں بہتری لانے کا فیصلہ کیا۔ کمپنی نے محسوس کیا کہ نظم وضبط قائم کرکے، کچھ نئے طریقے لاگو کرکے، کچھ نئے ضوابط بنا کے اور باقاعدہ معائنے کرکے یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا جائے؟ کمپنی کیا قدم اٹھائے؟ کمپنی نے سرکاری پنڈتوں کا تقرر کیا اور ہر ایک کے ذمے چار سے پانچ تک اسکول دیے گئے۔ ان پنڈتوں کا کام پاٹھ شالاؤں میں جا کر معیار تدریس کو بہتر بنانا ہوتا تھا۔ ہر استاد سے وقتاً فوقتاً رپورٹ لی جاتی اور وہ باقاعدہ نظام الاوقات کے مطابق کلاسیں لیتا۔ اب تعلیم درسی کتابوں کی بنیاد پر ہوتی اور ہر سال ان کا امتحان لیا جاتا۔ طلبا سے ایک مقررہ فیس وصول کی جاتی اور وہ باقاعدہ کلاسوں میں آتے، اپنی جگہوں پر بیٹھتے اور نظم وضبط کی پابندی کرتے۔

جو پاٹھ شالائیں نئے قوانین کو قبول کرتیں ان کو سرکاری مالی امداد ملتی اور جو نئے نظام کے تحت کام کرنا پسند نہ کرتیں انھیں سرکاری امداد نہ دی جاتی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایسا ہوا کہ جو استاد اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے ان کو سرکار سے امداد یافتہ اور سرکار سے منظور شدہ پاٹھ شالاؤں سے مقابلہ کرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔

نئے ضوابط اور نئے معمولات کے کچھ اور نتائج بھی مرتب ہوئے۔ سابقہ نظام کے تحت غریب کسانوں کے بچے پاٹھ شالاؤں میں تعلیم حاصل کرلیتے تھے کیوں کہ ان کا نظام الاوقات لچکدار ہوتا تھا۔ نئے ضابطوں کے مطابق باقاعدہ حاضری ضروری تھی خواہ فصل کی کٹائی کا ہی زمانہ کیوں نہ ہو جس میں غریب بچے کھیتوں میں جا کے کام کرتے تھے۔ اسکول میں غیر حاضری کو ضابطہ شکنی سمجھا جاتا اور اسے تعلیم سے عدم دلچسپی پر محمول کیا جاتا تھا۔

قومی تعلیم کا ایجنڈا

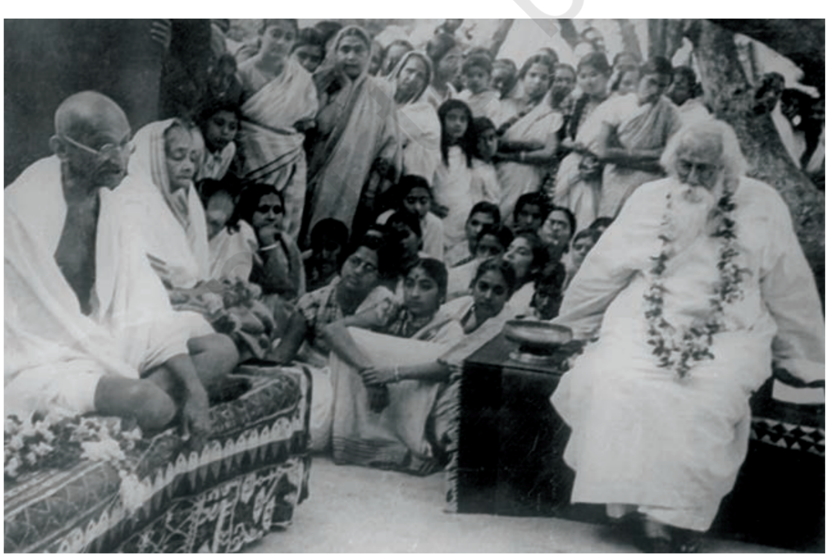
یہ صرف برطانوی اعلیٰ افسران ہی نہیں تھے جو ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں سوچتے تھے۔ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مفکرین نے بڑے پیمانے پر تعلیمی توسیع کی ضرورت پر سوچنا اور بات کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوروپ کی ترقی سے متاثر ہو کر کچھ ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ مغربی تعلیم ہندوستان کو جدید بنانے میں معاون ہوگی۔ انھوں نے انگریزوں پر زور ڈالا کہ وہ مزید اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھولیں اور تعلیم پر مزید پیسہ خرچ کریں۔ ان کوششوں کے بارے میں آپ اگلے باب میں پڑھیں گے۔ لیکن کچھ ایسے ہندوستانی بھی تھے جو بہر حال مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ ان میں مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کہتے تھے۔

''انگریزی تعلیم نے ہمیں غلام بنا دیا''

مہاتما گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ نوآبادیاتی تعلیم نے ہندوستانیوں کے ذہنوں میں احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔ اس تعلیم کے نتیجے میں وہ مغربی تہذیب کو برتر سمجھنے لگے ہیں اور اپنی تہذیب پر فخر کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کہتے تھے کہ اس تعلیم میں زہر ہے، یہ تعلیم قابلِ مذمت ہے، اس نے ہندوستانیوں کو غلام بنا دیا اور ان کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان پر مغرب کا ایسا جادو چلا ہے کہ یہ مغرب کی ہر چیز کی تعریف کرنے لگے ہیں اور ان اداروں میں پڑھنے والے طلبا برطانوی راج کے گن گانے لگے ہیں۔ مہاتما گاندھی ایسی تعلیم چاہتے تھے جس سے ہندوستان میں عزتِ نفس اور خود شناسی کا احساس پیدا ہو۔ قومی تحریک کے دوران انھوں نے طلبا سے کہا کہ وہ برطانیہ کو یہ دکھانے کے لیے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیں کہ اب وہ مزید غلام بننے کو تیار نہیں ہیں۔

شکل 9 – مہاتما گاندھی اور کستوربا گاندھی شانتی نکیتن میں رابندرناتھ ٹیگور اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے، *1940*



مہاتما گاندھی نے بڑی شدت سے یہ بات محسوس کی کہ ذریعۂ تعلیم ہندوستانی زبانیں ہی ہونی چاہئیں۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ وہ اپنے سماجی ماحول سے کٹ گئے ہیں اور انھیں ''اپنے ہی ملک میں اجنبی'' بنا دیا گیا ہے۔ وہ غیر ملکی زبان بولتے ہیں اور اپنی ہی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ اپنے ہی لوگوں سے جڑے رہنے کے طریقے بھول چکے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے کہا کہ مغربی تعلیم عملی معلومات اور تجربات کے بجائے یہ تعلیم درسی کتابوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کا قول تھا کہ تعلیم کا مقصد ذہن اور روح کی بالیدگی ہے۔ خواندگی یعنی صرف لکھنا پڑھنا جان لینے کو فی نفسہ تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنا چاہیے، ہنر سیکھنا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ مختلف چیزیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ اس سے ان کے ذہن کا ارتقا ہوگا اور ان کے اندر تفہیم کی صلاحیت پروان چڑھے گی۔

جب قومیت کے جذبات پھیلنے لگے تو دیگر مفکرین نے بھی قومی تعلیم کے نظام کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ یہ انگریزوں کے قائم کردہ طریقے سے نمایاں طور پر مختلف ہونا چاہیے۔

ماخذ 3

''خواندگی فی نفسہ تعلیم نہیں ہے''

مہاتما گاندھی نے لکھا تھا:

تعلیم سے میرا مطلب ہے انسان کے جسم، ذہن اور روح کی ہمہ جہتی ترقی۔ تعلیم سے بچے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ خواندگی نہ تعلیم کا مقصد ہے اور نہ اس کا آغاز۔ یہ تو صرف ایک ذریعہ ہے جس سے ایک فرد کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں تو کسی بچے کی تعلیم اس کو کوئی سودمند دستکاری سکھا کر اور اس قابل بنا کر کروں گا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے ساتھ ہی ساتھ کمانا شروع کر دے۔...... میں یہ مانتا ہوں کہ تعلیم کے ایسے نظام کے تحت جسم و روح کی بلند ترین ترقی ممکن ہے۔ دستکاری کوئی بھی ہو صرف مشینی طور پر نہ سکھائی جائے جیسا کہ آج کل ہوتا ہے بلکہ اس کو سائنٹفک طور پر سکھایا جائے یعنی بچہ یہ جان لے کہ کوئی عمل کیوں اور کس لیے ہوتا ہے۔

دی کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی، جلد 72، صفحہ 79

ٹیگور کا ’شانتی نکیتن‘

آپ میں سے بہت سے لوگوں نے شانتی نکیتن کے بارے میں سنا ہوگا۔ کیا آپ کو علم ہے کہ شانتی نکیتن کس نے اور کیوں قائم کیا تھا؟

اس ادارے کو 1901 میں رابندر ناتھ ٹیگور نے شروع کیا تھا۔ جب ٹیگور چھوٹے تھے تو انھیں اسکول جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کو لگتا تھا کہ اسکول کا ماحول گھٹا گھٹا اور بڑا سختیوں بھرا ہوتا ہے۔ وہ ان کو بالکل جیل معلوم ہوتا تھا کیوں کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہاں کر ہی نہیں پاتے تھے۔ اسی لیے جب بچے استاد کی باتیں سنتے تو ٹیگور کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہوتا۔

شکل 10 – 1930 کی دہائی میں شانتی نکیتن میں ایک کلاس چل رہی ہے

یہاں کے ماحول — پیڑوں اور کھلی فضا پر غور کیجیے۔



کلکتے میں اسکولی ایام کے تجربے نے تعلیم کے بارے میں ٹیگور کے خیالات کو تشکیل دیا۔ بڑے ہو کر انھوں نے ایک ایسا اسکول قائم کرنا چاہا جہاں بچے خوش رہ سکیں، جہاں وہ خود کو آزاد محسوس کریں، اپنی تخلیقی صلاحیتوں، خیالات اور خواہشات کو سمجھ سکیں۔ ٹیگور نے محسوس کیا کہ بچپن ایسا زمانہ بن جائے جب برطانیہ کے قائم کردہ اسکولی نظام کے سخت اور جابرانہ نظم وضبط سے باہر رہ کر بچے خود کچھ سیکھ سکیں۔ استادوں میں تخیل ہو، وہ بچے کو سمجھ سکیں اور اس کے شوق علم کو بڑھانے میں مدد کر سکیں۔ ٹیگور کے مطابق موجودہ اسکول بچے کی تخلیق کی فطری خواہش اور اس کے احساس تجسس کو دبا دیتے ہیں۔

ٹیگور کا نظریہ تھا کہ تخلیقی آموزش کے لیے ایک فطری ماحول ہونا چاہیے اسی لیے انھوں نے کلکتہ سے 100 کلومیٹر دور ایک دیہی ماحول میں اپنا ایک اسکول قائم کیا۔ وہ اس کو ”امن کا گہوارہ“ (شانتی نکیتن) سمجھتے تھے جہاں بچے فطرت سے ہم آہنگ ہو کر اپنی خلاّقی کا اظہار کر سکیں۔

تعلیم کے بارے میں گاندھی جی اور ٹیگور کی سوچ یکساں تھی۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ اختلافات بھی تھے۔ گاندھی جی مغربی تہذیب اور اہل مغرب کی مشینوں اور

ٹیکنالوجی پر انحصار کے سخت خلاف تھے۔ ٹیگور جدید مغربی تہذیب کے عناصر اور ہندوستانی تہذیب کی اعلیٰ روایت کو باہم ملانا چاہتے تھے۔ آرٹ، موسیقی اور رقص کے ساتھ ساتھ ٹیگور شانتی نکیتن میں سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کی ضرورت پر بھی زور دیتے تھے۔

اسی طرح بہت سے افراد اور مفکرین اس سلسلے میں غور وفکر کر رہے تھے کہ قومی تعلیمی نظام کے خدوخال کیسے ہوں۔ کچھ لوگ تو برطانوی نظام تعلیم کے اندر ہی کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اسی نظام کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا جائے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو سکیں۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ایک متبادل نظام تعلیم مرتب کیا جائے تا کہ تعلیم ایک سچے قومی تمدن کے دائرے میں رہ کر دی جا سکے۔ سچی قومی تہذیب کیا ہے؟ یہ کون طے کرے گا؟ 'قومی تعلیم' کیسی ہونی چاہیے اس پر بحث آزادی کے بعد بھی چلتی رہی۔



شکل 11 – کوئمبٹور میں واقع مشنری کے اسکول میں کھیلتے ہوئے بچے، ابتدائی بیسویں صدی

انیسویں صدی کے وسط تک عیسائی مبلغین اور ہندوستانی اصلاحی انجمنوں نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کر لیے تھے۔

تعلیم — مہذب بنانے کے ایک مشن کی حیثیت سے

ایجوکیشن ایکٹ 1870 کے نافذ ہونے تک انیسویں صدی کے بڑے حصے میں عام آبادی کے لیے تعلیم عام نہیں ہوئی تھی۔ بچہ مزدوری بڑے پیمانے پر عام تھی، غریب بچے اسکول نہیں بھیجے جاتے تھے کیوں کہ ان کی کمائی خاندان کی بقا کے لیے بڑی اہم تھی۔ اسکولوں کی تعداد محدود تھی۔ یا تو چرچ کے قائم کردہ اسکول تھے یا پھر دولت مند افراد کے۔ ایجوکیشن ایکٹ کے لاگو ہونے کے بعد ہی سرکاری اسکول کھلے اور لازمی تعلیم شروع ہوئی۔

ٹامس آرنلڈ جو رگبی کے پرائیویٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے اس دور کے ایک بہت اہم ماہر تعلیم مفکر تھے۔ انھوں نے ثانوی اسکول کے لیے ایک ایسے نصاب کی حمایت کرتے ہوئے جس میں 2000 سال قبل لکھے گئے رومی اور یونانی کلاسکس کا تفصیلی مطالعہ شامل ہو، کہا تھا:

> عام طور پر ہمارے انگلش اسکولوں کے نصاب تعلیم میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا ایک سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ہمارے ذہنوں کو تسلسل کے ساتھ ماضی سے وابستہ رکھتا ہے۔ ہم روز ایسی زبانوں، تاریخ اور ان لوگوں کے افکار سے واسطہ رکھتے ہیں جو تقریباً دو ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے حیات تھے......

آرنلڈ کا خیال تھا کہ کلاسکس کا مطالعہ دماغ کو نظم وضبط میں رکھتا ہے۔ درحقیقت وقت کے اہم ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ یہ ڈسپلن بہت ضروری ہے کیوں کہ نوجوان عام طور پر غیر مہذب ہوتے ہیں جن کو مہذب بنانے اور کنٹرول میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج کے مہذب افراد بننے کے لیے ان کو جائز و ناجائز اور مناسب و نامناسب رویوں کا ادراک ضروری ہے۔ تعلیم کا مقصد اور خاص طور پر اس تعلیم کا جو ذہنوں کو منظّم کرتی ہے یہ ہے کہ وہ اس راستے کی جانب رہنمائی کرے۔

کیا آپ اس بارے میں اپنی کوئی رائے دیں گے کہ ان خیالات نے انگلینڈ کے غریب اور نو آبادیات کے ’دیسی لوگوں‘ کی تعلیم کے بارے میں عام فکر کو کتنا متاثر کیا ہوگا؟

دوہرائیے

1۔ جوڑی ملائیے :

ولیم جونز	انگریزی تعلیم کا فروغ
رابندر ناتھ ٹیگور	قدیم تہذیبوں کا احترام
ٹامس میکالے	گرو
مہاتما گاندھی	فطری ماحول میں تعلیم
پاٹھ شالائیں	انگریزی تعلیم کے مخالف

تصور کیجیے

تصور کیجیے کہ آپ مہاتما گاندھی اور میکالے کے درمیان انگریزی تعلیم کے موضوع پر ہونے والے مباحثے میں شریک تھے۔ آپ نے جو مکالمے وہاں سنے ان کو ایک صفحے پر لکھیے۔

2۔ بتائیے کہ درج ذیل بیانات میں سے کون صحیح ہے کون غلط:

(a) جیمز مل مستشرقین کا سخت مخالف تھا۔

(b) تعلیم پر 1854 کا مراسلہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھا۔

(c) مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ خواندگی کا فروغ تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔

(d) رابندر ناتھ ٹیگور کے خیال میں بچوں کو سخت ڈسپلن کا پابند رہنا چاہیے۔

گفتگو کیجیے

3۔ ولیم جونز نے ہندوستانی تاریخ، فلسفے اور قانون کے مطالعے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

4۔ جیمز مل اور ٹامس میکالے نے یہ کیوں سوچا کہ ہندوستان کے لیے یوروپی تعلیم ضروری ہے؟

5۔ مہاتما گاندھی بچوں کو دستکاری کیوں سکھانا چاہتے تھے؟

6۔ مہاتما گاندھی نے یہ کیوں سوچا کہ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو غلام بنا دیا؟

کر کے دیکھیے

7۔ اپنے دادا، دادی سے معلوم کیجیے کہ انھوں نے اسکول میں کیا کیا پڑھا تھا؟

8۔ اپنے اسکول یا اپنے علاقے کے کسی دوسرے اسکول کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔